دلائل السنن والآثار

(۷)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

تقسیم احادیث بلحاظ تعریف مندرجہ ذیل ہے :۔

(۱) قولی (۲) فعلی (۳) تقریری (یعنی آپ کا کسی بات کو سن کر یا فعل کو دیکھ کر اسے جائز رکھنا)

اور تقسیم احادیث بلحاظ تعداد رواۃ یوں ہے :۔

(۱) متواتر، (۲) احاد (۳) مشہور (۴) عزیز (۵) غریب۔

پھر حالات راویان کے اعتبار سے تین قسمیں قرار پاتی ہیں :۔

(۱) مردود جسکی تین قسمیں ہیں موضوع [1]، متروک [2]، منکر [3]

(۲) ضعیف جسکی چار قسمیں ہوتی ہیں (۱) منقطع، (۲) معضل (۳) معلق (۴) مرسل۔

(۳) مقبول جسکی دو قسمیں ہیں :۔ ایک حسن، دوسری صحیح، ان میں سے بعض کے متعلق کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

خبر متواتر | خبر متواتر سے قریب قریب ویسا ہی علم یقین حاصل ہوتا ہے جیسے آنکھوں سے دیکھنا۔ اس دعوی پر قرآن مجید شاہد ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ۔ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ۔ دیکھو قرآن جن لوگوں کو خطاب کر رہا ہے انہوں نے یہ واقعات خود نہ دیکھے تھے، صرف متواتر خبروں سے ان کو اطلاع پہنچی تھی۔ مگر قرآن اس

علم کو رویت سے تعبیر کرتا ہے۔ یہیں سے یہ لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ تواتر سے جو علم حاصل ہو اس کی حیثیت مشاہدہ کی سی ہے۔

اقسام تواتر (۱) تواتر اسناد یعنی جس خبر کی سندیں بلا تعیین کثیر ہوں، اس قدر کہ عادۃً اتنے راویوں کا جھوٹ پر اتفاق کرنا یا ان سے اتفاقیہ جھوٹ صادر ہونا محال ہو، اور یہ کثرت ابتدا سے انتہا تک یکساں ہو، کسی مرحلہ میں راویوں کی تعداد کم نہ ہو، اور خبر مفید علم ضروری ہو اور اس کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جو محسوس ہو۔ عامہ محدثین کے نزدیک انہی شرائط پر متواتر کا تحقق موقوف ہے، اور ایسی خبر متواتر علم الاسناد کے دائرۂ بحث سے خارج سمجھی جاتی ہے اسلیے کہ علم الاسناد میں صحت یا ضعف حدیث سے بغرض وجوب عمل یا ترک عمل جو بحث کی جاتی ہے وہ بحیثیت رجال ہوا کرتی ہے، اور خبر متواتر کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بحث و حجت کے بغیر واجب العمل سمجھی جاتی ہے۔

(۲) تواتر طبقہ جسکو تواتر لفظی بھی کہا جاتا ہے، مثلاً قرآن مجید، کہ وہ لفظ بلفظ ایک نسل سے دوسری نسل تک متواتر چلا آرہا ہے۔ یہ تواتر ایسا تواتر ہے کہ محدثین کے اصول کے مطابق اسکے لیے اسناد کا منضبط ہونا مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی، اسلیے کہ اسناد کی ضرورت خبر احاد میں ہوتی ہے جہاں شک اور ظن کا امکان ہوتا ہے نہ کہ ایسی متواتر چیز میں جو لفظاً کثیر التعداد آدمیوں سے کثیر التعداد آدمیوں تک منتقل ہوتی چلی جا رہی ہو۔ اس تواتر لفظی میں الفاظ بھی یکساں اور متواتر ہوتے ہیں اور اس تعریف کی رو سے خبر متواتر دو تین سے نادر نہیں ہیں۔ غالباً اسی قسم کی خبر متواتر کے متعلق ابن صلاح وغیرہ کا خیال ہے کہ بہت ہی قلیل الوجود عدیم النظیر ہے۔

(۳) تواتر عمل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے سے آج تک ایک جم غفیر برابر کسی امر دینی پر عمل کرتا رہا ہو، جس کا عادۃً جھوٹ یا غلطی پر اتفاق کرنا محال ہو، مثلاً پانچ وقت کی نماز اور رمضان کے روزے کہ ان پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے آجتک متواتر عمل ہو رہا ہے، کبھی اس عمل میں کوئی فصل یا

التوا نہیں ہوا، چین سے لیکر مراکش تک کروروں مسلمان نسلاً بعد نسلٍ اس عمل کو یونہی کرتے چلے آرہے ہیں، اور آج کسی شخص کے لیے یہ دعویٰ کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھی یا پورے رمضان کے روزے نہیں رکھے۔ زکوٰۃ، حج اور قربانی وغیرہ اعمال بھی اسی قبیل کے متواتر اعمال ہیں، اور یہ تواتران کے سنت نبوی ہونے کی ایسی یقینی دلیل ہے کہ ایک عقل باختہ و ہوش ربودہ آدمی کے سوا کوئی اس میں شک نہیں کرسکتا۔

(۴) تواتر قدر مشترک جسکو تواتر معنوی کہا جاتا ہے وہ خبر ہے جسکی روایت میں تمام راویوں کے الفاظ گو یکساں نہ ہوں مگر تمام مختلف الفاظ میں ایک معنی ومفہوم مشترک ہو۔ مثلاً کوئی یہ بیان کرے کہ حاتم نے سَو دینار دیئے، دوسرے نے کہا کہ سَو اونٹ دیئے، تیسرے نے ۱۰ گھوڑے بیان کیے اور یہ سلسلہ حد تواتر کو پہونچ گیا۔ یہ سب اخبار کم از کم اس ایک امر میں مشترک ہیں کہ حاتم نے اپنے مال میں سے کچھ ضرور دیا جو اسکی سخاوت کی دلیل ہے۔ اس قسم کے تواتر میں ایک ایک واقعہ تو اپنی جگہ یقینی نہیں ہوتا، مگر مجموعی حیثیت سے جو معنی ان سب خبروں میں مشترک ہوتا ہے وہ ضرور یقینی ہوتا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلعم سے معجزات کا صدور، آپکے غزوات وسیر، اسلام کے ضروری احکام، اوامر و نواہی وغیرہ کی روایات، اگرچہ یہ مفرد اور احاد طریقہ پر ہوں تاہم قدر مشترک متواتر قطعی ہے۔

حدیث متواتر کے موجود ہونے پر روشن دلیل یہ ہے کہ کتب احادیث، جو علمائے عصر میں متداول ہیں ان کا انتساب جن مصنفین کی طرف کیا جاتا ہے یہ ایک یقینی وقطعی امر ہے۔ پس یہ مصنفین اگر انھیں کتابوں میں متفق ہو کر ایک حدیث کو اس قدر رواۃ سے روایت کریں کہ عادۃً نہ ان کا جھوٹ پر اتفاق کرنا اور نہ ان سے اتفاقیہ جھوٹ صادر ہونا ممکن ہو تو بلاشک یہ حدیث متواتر ہو گی اور ضرور اسکا انتساب قائل کی طرف بطور علم یقینی ہو گا۔ اسی قسم کی احادیث کتب مشاہیر میں بکثرت موجود ہیں، چنانچہ حدیث مسح خفین، و حوض کوثر، تقریباً ستر صحابہ سے مروی ہے، بنائے مساجد کی احادیث اثنی صحابہ

سے اور آنحضرت صلعم کی طرف جھوٹی حدیث کی وعید ننّو صحابہ، نیز حدیث شفاعت چالیس سے زیادہ صحابہ سے مروی ہے، حدیث ویل للاعقاب من النار، اور حدیث لانورث ماترکناہ صدقۃ اور انزل القرآن علی سبعۃ احرف وحدیث الحساب وحدیث النظر الی اللہ تعالی وحدیث غسل الرجلین فی الوضوء وحدیث عذاب القبر وغیرہ کو ابن جوزی وغیرہ نے متواتر فرمایا ہے۔

اوپر جو یہ لکھا گیا ہے کہ "خبر کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جو محسوس ہو" سو اسکا مفہوم یہ ہے کہ راوی یوں کہے رأیت رسول اللہ صلعم فعل کذا یا سمعت رسول اللہ صلعم قال کذا یعنی میں نے حضور کو ایسا کرتے دیکھا، یا آپ کو ایسا کہتے سنا۔ اس قسم کی خبر متواتر ہو سکتی ہے۔ رہی وہ خبر جس کا تعلق محض عقل سے ہو مثلاً وجود صانع تو یہ متواتر نہیں ہو سکتی۔

علم کی دو قسمیں ہیں ضروری اور نظری۔ ضروری وہ علم ہے جو قیاس عقلی کے بغیر حاصل ہو مثلاً جس چیز کو آپ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کا علم آپ کو محض مشاہدہ سے حاصل ہو جاتا ہے اور اسکے لیے قیاس عقلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اسکے نظری وہ علم ہے جو بذریعہ نظر حاصل ہو۔ معلومات یا مظنونات میں ترتیب دینے کو نظر کہتے ہیں جس سے مجہول شئے کا علم یا ظن حاصل ہو۔ اور اعتقاد قطعی واقعی کو یقین کہا جاتا ہے۔ اشاعرہ میں سے امام الحرمین اور معتزلہ میں سے ابو الحسین بصری و کعبی کا قول ہے کہ خبر متواتر سے "علم یقینی ضروری" حاصل نہیں ہوتا بلکہ نظری ہوتا ہے۔ مگر قول صحیح یہی ہے کہ خبر متواتر مفید علم یقینی ضروری ہوتی ہے، اسلیے کہ خبر متواتر سے عوام کو بھی جنھیں نظر کی صلاحیت نہیں ہوتی علم حاصل ہوتا ہے۔ اگر متواتر مفید علم نظری ہوتی تو عوام کو اس سے کیونکر علم حاصل ہوتا۔ مذکورہ اشکالات

سلہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت وغیرہ

سلہ المستصفیٰ الغزالی۔

کو سمجھو تاکہ ظن و تخمین کی راہ مسدود اور علم و یقین، اطمانیت و شرح صدر اور مشاہدات و قطعیت کا فتح باب ہو، سچ فرمایا کسی عارف نے،

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو ایں جاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

خبر احاد متواتر کے سوا خبر کی بقیہ اقسام یعنی مشہور یا مستفیض و عزیز اور غریب سب کو اخبار احاد اور ہر ایک کو خبر واحد کہا جاتا ہے۔ مشہور و عزیز و غریب حقیقتہً خبر احاد کی قسمیں ہیں۔ مگر لغتہً خبر واحد وہ ہے جسے ایک ہی شخص روایت کرے۔ اور اصطلاحاً وہ ہے جس میں متواتر کی کل شرطیں موجود نہ ہوں۔ اس قسم کی خبروں میں بعض مقبول ہوتی ہیں اور بعض مردود۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا واجب العمل ہونا ان کے راویوں کے حالات پر مبنی ہے۔ اگر راویوں میں اوصاف قبولیت کے موجود ہوں تو ان کی خبر کی صداقت کا گمان غالب ہوگا اور وہ واجب العمل ہوگی۔ اور اگر اوصاف مردودیت موجود ہوں ہو تو کذب کا گمان غالب ہوگا اور وہ متروک العمل سمجھی جائیگی۔ اور اگر رواۃ میں قبول و رد کے اوصاف کوئی بھی موجود نہ ہوں مگر قرینہ قبولیت کا موجود ہو تو خبر مقبول ہوگی ورنہ رد کر دی جائیگی۔ اور اگر کوئی قرینہ بھی نہ پایا جائے تو توقف کیا جائیگا اور یہ توقف محض اوصاف عدم قبولیت کی بنا پر ہوگا۔

اخبار احاد میں سے جن خبروں کو قبول کیا جاتا ہے ان کی ذاتی حیثیت تو اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ ان سے کسی واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے کا محض گمان غالب حاصل ہوتا ہے، لیکن جبکہ ان کی مدد پر قرائن موجود ہوں تو بقول مختار وہ مفید علم یقینی نظری ہوتی ہیں۔ گو بعض نے اسکا انکار بھی کیا ہے مگر درحقیقت یہ نزاع لفظی ہے۔ اصل یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں کسی بات کو جب "ظنی" کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اسکی صحت کا پہلو راجح اور شک کا کمزور ہے۔ اسی لیے خبر احاد پر عمل کرنا واجب ہے جب تک کہ وہ قرآن یا رسول اللہ صلعم کی ثابت شدہ سنت کے خلاف نہ ہو۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ خبر احاد مفید علم ہوتی ہیں وہ علم سے علم نظری مراد لیتے ہیں۔ اور جو

انکار کرتے ہیں کہ خبر احاد مفید علم نہیں ہوتیں انکی مراد علم سے علم ضروری ہے، یعنی اخبار احاد قرائن کے ساتھ مل کر مفید علم ضروری نہیں ہوسکتیں اسلیے کہ یہ خاصہ صرف متواتر ہی کا ہے۔ اخبار احاد جو قرائن کے ساتھ مل کر مفید علم نظری ہوتی ہیں، انکی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ خبر جس کو شیخین (بخاری و مسلم) نے بالاتفاق قبول کیا ہو۔ ایسی خبر کو اپنے رجال اور اپنے اسناد کے علاوہ اس وجہ سے مزید تقویت حاصل ہوتی ہے کہ اسے فن حدیث کے دو ایسے جلیل القدر محققین نے قبول کیا جو احادیث کی چھان بین میں غایت درجہ محتاط تھے، جنہوں نے احادیث کے پرکھنے میں کمال درجہ کا امتیاز پیدا کیا، اور جن کو عموماً علمار فن کا اعتماد حاصل ہوا۔ ان قرائن کی بنا پر صحیحین کی احادیث مفید علم نظری ہوتی ہیں بشرطیکہ ان احادیث میں حفاظ حدیث نے جرح نہ کی ہو، اور ان میں ایسا تعارض بھی واقع نہ ہوا ہو کہ ایک کو دوسری پر ترجیح نہ حاصل ہو۔ پس صحیحین کی وہ حدیثیں جو جرح اور تعارض مذکور سے محفوظ ہوں اجماعاً مفید علم نظری ہوتی ہیں۔ (یہاں یہ شبہہ کیا جاسکتا ہے کہ محدثین کا اجماع اس پر نہیں ہے کہ صحیحین کی حدیثیں مفید علم نظری ہوتی ہیں بلکہ صرف ان کے واجب العمل ہونے پر اجماع ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ واجب العمل ہونے میں صحیحین کی احادیث کی خصوصیت نہیں۔ غیر صحیحین کی احادیث بھی بشرط صحت واجب العمل سمجھی جاتی ہیں۔ پھر خصوصیت کے ساتھ صحیحین کے بارے میں جو اجماع ہوا تو وہ اسی بنا پر ہونا چاہیے کہ ان کی احادیث مفید علم نظری ہوتی ہیں، چنانچہ استاد ابو اسحٰق اسفرائینی اور امام الحدیث ابو عبد اللہ الحمیدی اور ابو الفضل بن طاہر وغیرہم نے اسکی تصریح کی ہے۔ البتہ یہ احتمال ممکن ہے کہ صحیحین کی جس خصوصیت پر اجماع ہوا وہ یہ ہو کہ صحیحین کی احادیث اور کتابوں کی احادیث سے صحیح تر ہیں)

(۲) وہ حدیث مشہور جسکی متعدد اسنادیں مختلف طرق سے ثابت ہوں اور وہ اسنادیں ضعف اور علل سے محفوظ ہوں۔ استاد ابو منصور بغدادی اور ابو بکر بن فورک نے تصریح کی ہے

کہ یہ حدیث بھی مفید علم نظری ہوتی ہے۔

(۳) وہ حدیث جو غریب نہ ہو اور جسکے سلسلۂ سند میں تمام رواۃ ائمہ حفاظ ہوں مثلاً ایک حدیث کی روایت امام احمد بن حنبلؒ نے ایک اور شخص کے ساتھ امام شافعیؒ سے کی پھر امام شافعیؒ نے ایک اور شخص کے ساتھ امام مالک سے اسکی روایت کی۔ سو بیشک یہ حدیث بھی مفید علم نظری ہوگی، اسلیے کہ ان رواۃ میں ایسے اوصاف قابلِ قبول موجود ہیں جن کے سبب سے یہ رواۃ ایک جم غفیر کے قائم مقام ہوسکتے ہیں جو شخص فنِ حدیث میں تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اگر امام مالک کی زبان سے کوئی روایت سنے تو کبھی اس کی صداقت میں شک نہ کریگا، البتہ احتمال سہو خطا باقی رہتا ہے، مگر جب ان کے ساتھ ان کا ہم پلہ ایک اور شخص بھی روایت میں شریک ہوگیا تو یہ احتمال بھی رفع ہوجائیگا

یہ تین قرینے ہیں جن کے مل جانے سے خبر واحد مفید علم نظری ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی حدیث میں تینوں قرائن مجتمع ہوتے ہیں۔ پھر تو اسکے مفید علم نظری ہونے میں کچھ بھی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ البتہ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خبر واحد مع قرائن مفید علم نظری تو ہوتی ہے مگر صرف اسی شخص کے لیے جسے فنِ حدیث میں تبحر اور راویوں کے حالات سے واقفیت ہو، اور جو علل قادحہ کو بھی جانتا ہو۔ ورنہ جو شخص ان امور سے نابلد ہو اسکے لیے اخبار احاد مذکورہ مع قرائن مفید علم نظری نہیں ہوسکتیں۔

مفہوم ظن اوپر لکھا جاچکا ہے کہ محدثین و فقہاء جو حدیث کو ظنی کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ صحت کا پہلو راجح اور شک کا کمزور ہے اور اس بنا پر یہ بالکل معقول بات ہے کہ ایسی خبر جب قرآن اور ثابت شدہ سنت رسول کے خلاف نہ ہو تو وہ عقلاً و نقلاً واجب العمل ہونی چاہیے۔ بعض حضرات کو لفظ ظن سے دھوکا ہوگیا، یا بالقصد تدلیس و تلبیس سے کام لیکر عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا انہیں عین خدمت دین و ملت نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے آیت اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اور اسی مضمون

کی دوسری آیات کو حجت بنا کر احادیث نبوی کے سارے دفتر پر خط نسخ پھیر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض یورپ زدہ اشخاص و رجال اس سیلاب میں بہہ نکلے اور بعض کم علم بدظنی میں مبتلا ہو گئے۔ مگر قرآن کا یہ زندہ معجزہ ہے کہ جب کوئی شخص اس کی آیات کو اسکے مقصود کے خلاف استعمال کرتا ہے تو وہ خود اسکی تردید کر دیتا ہے۔ ابتک کے تجربات اس پر گواہ ہیں، جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لہٰذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ہی سے مفہوم لفظ ظن کا سراغ لگایا جائے۔

قرآن مجید کی آیات کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہر اس رائے، عقیدہ یا خیال کو لفظ (ظن دگمان) سے تعبیر کرتا ہے جو حقیقت کے صریح مشاہدہ کے بجائے دلائل اور قرائن کی بناء پر قائم ہو۔ یہ ظن کا عام مفہوم ہے، اور اس مفہوم کے اعتبار سے قرآن نے مطلقاً ہر ظن کو غلط اور ہر ظن کی پیروی کو مذموم نہیں ٹھیرایا ہے، بلکہ ظن کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کا حکم الگ ہے۔ مثلاً:

(۱) ظن کی ایک قسم وہ ہے جو بالکل علم حق کے مطابق ہے، چنانچہ فرمایا اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (جو لوگ گمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں) یہ عقیدہ کہ انسان اپنے پروردگار کے پاس جانے والا ہے اگرچہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے "ظن" ہی ہے، لیکن کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس ظن کے اتباع کو قرآن کریم مذموم ٹھیراتا ہے یا اس پر اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا کا اطلاق ہوتا ہے؟

(۲) دوسری قسم کا ظن وہ ہے جو کسی مضبوط دلیل یا قرینے کی بناء پر پیدا ہو، جیسے فَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ (داؤد نے گمان کیا کہ ہم نے اسکی آزمائش کی ہے)۔ اس قسم کے ظن کی پیروی کرنے کو قرآن نہ صرف مستحسن قرار دیتا ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کی پیروی نہ کرنے پر سخت ملامت بھی کرتا ہے چنانچہ واقعۂ افک کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا۔ یعنی جب تم نے حضرت عائشہ کے متعلق یہ تہمت سنی، تو ام المومنین کی پاک سیرتی

کے جو قرائن موجود تھے ان کی بنا پر مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے دلوں میں نیک گمان کیوں نہ کیا؟ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب ایسے قرائن اور دلائل موجود ہوں جو کسی امر کا گمان غالب پیدا کرنے کے لیے کافی ہوں تو اس گمان کی پیروی کرنا نہیں بلکہ نہ کرنا برا ہے۔ آیت اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا کا تعلق اس قسم کے گمان سے بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہو سکتا۔

(۳) تیسری قسم کا ظن وہ ہے جو کسی دلیل و حجت پر مبنی نہ ہو بلکہ محض اوہام اور بے اصل قیاسات پر مبنی ہو۔ جیسے وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا (تم اللہ کے متعلق طرح طرح کے گمان کرنے لگے) اور فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (پھر اس نے گمان کر لیا کہ ہم اس پر قابو نہیں پا سکتے) اور اسی قبیل سے مشرکین کا یہ گمان بھی ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے آلہہ بھی موجود ہیں یا اللہ بیٹے بیٹیاں اور بیوی رکھتا ہے۔ گمان کی اسی قسم کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ اور یہی وہ قسم ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا یعنی گمان آدمی کو علم حق سے بے نیاز نہیں کرتا، یا گمان علم حق کی قائم مقامی کچھ بھی نہیں کرتا۔

اب ہر صاحب بصیرت آدمی دیکھ سکتا ہے کہ اخبار و احادیث سے جو ظن حاصل ہوتا ہے وہ قرآن کی تقسیم کے مطابق ظن کی تیسری قسم میں تو کسی طرح شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ نرا وہمی ظن نہیں ہے اور وہ پہلی قسم میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا، اسلیے کہ اعتقاد یوم آخر کی طرح اسکی تائید میں ایسی زبردست حجتیں بھی نہیں ہیں جو اسے ایمان و یقین کی حد تک پہنچا دیں۔ لامحالہ اسے دوسری ہی قسم میں شمار کرنا پڑیگا کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کا حکم ہم تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مسلسل سند کے ساتھ پہنچ رہا ہے اور اس روایت کو بڑے بڑے متقی، محقق اور محتاط اماموں نے قبول بھی کیا ہے، تو ہمیں اس امر کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم دیا ہوگا، اور جب بھی کسی حکم کے متعلق

ظن غالب و راجح حاصل ہو جائے تو اسکی پیروی نہ کرنا ویسی ہی بدبختی ہے جیسی بدبختی ان لوگوں کی تھی جنہوں نے ام المومنین کی پاک سیرتی کا ظن غالب پیدا کرنے والے قرائن کی پیروی نہ کی۔

اختصار اور روایت بالمعنی سنن و آثار نبوی کے سلسلہ میں ایک اہم اصولی بحث روایت بالمعنی کی آتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ چیز بھی سخت فتنہ کا سبب بنگئی یا بنا دی گئی ہے، جو تمامتر اصول حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ روایت بالمعنی کے متعلق کتب اصول میں آٹھ مذاہب بیان کئے گئے ہیں، لہذا نفس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھانے کے لیے ہم اس موقع پر بعض ضروری اور اصولی فروق یہاں بیان کرتے ہیں۔

اہل اصول کا اجماعی مسئلہ ہے کہ روایت بالمعنی ایسے شخص کے لیے جائز ہے جو الفاظ کے معانی و مفاہیم سے پوری طرح واقف ہو اور جو ایسا نہیں ہے اسکے لیے قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عجمی ماہر حدیث اگر اپنی زبان میں حدیث کا ترجمہ کرے تو جائز ہے۔ جب الفاظ حدیث کی تبدیلی غیر زبان سے جائز ہوئی تو عربی الفاظ سے بطریق اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔ بعض کا قول ہے کہ مرکبات میں نہیں صرف مفردات میں تبدیلی جائز ہے۔ اور بعض یہ فرماتے ہیں کہ جسے الفاظ حدیث محفوظ ہوں صرف اسی کے لیے جائز ہے کیونکہ بوجہ دفور تحفظ وہ معنوی تصرف کرسکتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ جو شخص الفاظ کو بھول گیا مگر اسکے معنی اسکے ذہن میں محفوظ ہیں تو بغرض استنباط حکم صرف اسی کے لیے یہ جائز ہے باقی جسکو الفاظ محفوظ ہوں اسکے لیے جائز نہیں۔ یہ ساری بحث جواز و عدم جواز کے متعلق تھی۔ مگر اولیٰ اور انسب یہی ہے کہ جسکو الفاظ حدیث محفوظ ہوں اسکو بلا تصرف حدیث روایت کرنی چاہیے۔ علامہ قاضی عیاضؒ کا قول ہے کہ روایت بالمعنی کا باب بالکل مسدود کردینا چاہیے تاکہ ناواقف شخص جسکو واقفیت کا دعوی ہو روایت بالمعنی پر جرأت نہ کرسکے۔

پس روایت بالمعنی کے جواز یا روایت بالمعنی کے موجود ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام روایات بالمعنی ہیں۔ دیکھو الفاظ استفتاح، تشہد، ادعیہ ماثورہ، احادیث صفات جوامع الکلم مثلاً انما الاعمال بالنیات، من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ، الحرب خدعۃ الخراج بالضمان، العجماء جبار، البینۃ علی المدعی وغیرہ کو روایت بالمعنی کرنا جائز نہیں۔ صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین میں بہت سے اکابر کا مذہب روایت باللفظ کا ہے۔ غالباً ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر راوی نے الفاظ رسول بعینہٖ محفوظ رکھے ہیں تو جو فصاحت و بلاغت اور جامعیت آنحضرت صلعم کے کلام میں ہے وہ دنیا کے کسی کلام میں نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ارباب لغت الفاظ کی تحقیق میں جس طرح اشعار عرب اور قرآن سے استدلال و استشہاد پیش کرتے ہیں اسی طرح احادیث نبوی سے بھی کرتے ہیں۔ جنھوں نے صحاح جوہری و لسان العرب سے الفاظ کی تحقیق کی ہوگی وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہونگے۔ ہم اس جگہ امام اللغۃ والادب جاحظ کا ایک بیان افادہ ناظرین کے لیے اور بالخصوص روایت بالمعنی کے بہانے سے تمام احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دینے والوں کی فہمائش کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اہل علم خود فیصلہ فرمائینگے کہ بحیثیت زبان کلام رسول کا کیا درجہ ہے سرسری اور سطحی طور پر مطالعہ کرنے اور پڑھنے پڑھانے سے یہ چیز نہیں آتی جب تک کہ کافی تیاری اور مطالعہ سے حاصل نہ کی جائے۔ ائمہ لغت جن پر آج ہماری عربی زبان کا دارمدار ہے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے احادیث کو باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو یا اسکی کسی حیثیت سے خدمت نہ کی ہو۔ بہر حال جاحظ کہتا ہے:۔

"احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا ہے جس کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں۔ وہ تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ جہاں بسط کی ضرورت تھی وہاں بسط سے کام لیا ہے اور جہاں اختصار کا موقع تھا وہاں اختصار سے۔ غریب اور غیر معروف الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ گری ہوئی

سوقیانہ زبان کا کہیں نشان تک نہیں پایا جاتا۔ آپ کی ہر گفتگو حکمت و معرفت کی آئینہ دار اور ہر کلام آپ کی قادر الکلامی اور ملکۂ راسخہ کا نمونہ ہے۔ یہی ایک ایسا کلام ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے محبت اور حُسنِ قبول کی چاشنی رکھی ہے۔ اس میں ہیبت اور حلاوت دونوں کا عجیب امتزاج نظر آتا ہے۔ ایجاز اور قلت الفاظ کے باوجود افہام و تفہیم کی مخصوص اور نمایاں خوبی پائی جاتی ہے۔ آپ کے کلام کا استقصار کر کے دیکھو کہیں تکرار اور اعادہ نہیں اور اسکے باوجود کہیں کلام میں تشنگی، اظہار مدعا میں نقص یا دلیل و حجت میں ضعف نہیں۔ آپ کے سامنے نہ کسی دشمن کو تاب مقاومت ہوئی اور نہ کوئی خطیب اپنے اعجاز بیان کے غرہ میں آپ کو خاموش کرنے کی جرأت کر سکا۔ بلکہ طویل اور مبسوط خطبوں کے مقابل میں آپ کا مختصر مگر جامع کلام برتر اور بڑھا ہوا ہے۔ نیز دشمن کو لاجواب کرنے کا انداز بیان بھی آپکا نرالا ہے۔ آپ حریف کو اسی کی معلومات سے خاموش کرتے ہیں۔ استدلال اور حجت کے لیے محض سچائی آپ کے پیش نظر ہوتی ہے۔ آپ اتنی ہی بات فرماتے ہیں جتنی ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہوتی ہے۔ مخاطب پر چوٹ کرنا اور طنز و تعریض سے کام لینا، یا زبان آوری اور الفاظ کی ڈھیٹ بندی سے سامعین کو مرعوب کرنا، یا تقریر میں مبالغہ اور بے جا جوش، اور بات کو حقیقت سے بڑھا کر بیان کرنا آپ کا شیوہ نہیں۔ آپ کو اس کا بھی لحاظ ہوتا کہ اثنائے گفتگو میں نہ بہت زیادہ ٹھہرتے اور رکتے، اور نہ بہت ہی عجلت فرماتے، اور نہ اتنی طویل اور نہ ہی اتنی مختصر گفتگو ہوتی کہ کلام کو عیب اور داغ لگے۔ پھر ان سب محاسن سے زیادہ بڑھکر سرورِ عالم صلعم کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ آپکا کلام اتنا منفعت بخش، ایسا جچا تلا، الفاظ میں ایسی صداقت، اسلوب ادا اتنا خوبصورت اور دلکش، سلاست و روانی ایسی اور مقاصد ایسے واضح اور روشن کہ اسکی مثال ڈھونڈھنی "دو کو کندن و کاہ برآوردن" کے مصداق ہے۔ انسانی کلام میں اس کی نظیر دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔"[۱]

۱ - البیان و التبیین -

علامہ مصطفےٰ صادق رافعی نے بھی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں (ص ۲۲۴-۲۲۴) فصاحت وبلاغت کلام نبوی پر بحث فرمائی ہے۔ نیز مصری عالم سید محمود شاکر نے بلاغت نبوی پر ایک مقالہ جولائی ۱۹۳۴ء کے رسالہ المقتطف ص ۱۱۴-۱۱۵ میں سپرد قلم فرمایا ہے جس میں وہ احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاغت کے انتہائی بلند مرتبہ پر ہے جس تک پہنچنے کی کوشش میں لوگوں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں"[۲]۔

خلاصہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی ہوئی تو ضرور ہے مگر احادیث میں اس کا بہت ہی کم حصہ ہے۔ صحیحین اور موطا امام مالکؒ کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر روایت باللفظ کا زیادہ حصہ موجود ہے۔ ایک صاحبِ ذوق آدمی ان احادیث کو پڑھ کر خود محسوس کر سکتا ہے کہ ان میں جو شانِ کلام پائی جاتی ہے وہ اپنے قائل کی بلند شخصیت کا صاف پتہ دے رہی ہے۔ کم تر شخصیت کے لوگوں کی زبان اس سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ دونوں کا فرق کسی ناقدانہ بصیرت رکھنے والے سے چھپ نہیں سکتا۔

<u>حذف و اختصار</u> | حدیث کے مفرد یا مرکب الفاظ میں سے کچھ الفاظ کو گھٹا کے اختصار کرنا یا بعض الفاظ کو انکے مترادف سے بدل دینا بالکل ناجائز ہے۔ البتہ جو شخص الفاظ کے معانی، اور قریب المعنی الفاظ کے باہمی فروق کو جانتا ہو اور جس میں یہ سمجھنے کی تمیز ہو کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنے سے معنی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اسکے لیے بقول اصح اختصار و ابدال دونوں جائز ہیں۔ اختصار حدیث کو محدثین نے جائز رکھا ہے مگر بایں شرط کہ اختصار کرنے والا صاحب علم ہو اسلیے کہ صاحب علم بغرض اختصار یا تو ان الفاظ کو حذف کریگا جن کا بقیہ حدیث سے کچھ تعلق نہ ہوگا یہانتک کہ بحیثیت دلالت و بیان ہر ٹکڑا ایک مستقل خبر قرار دیا جا سکتا ہے یا پھر وہ ان الفاظ کو حذف کریگا جن پر بقیہ حدیث دلالت کرتی ہو۔ بخلاف جاہل کے کہ وہ استثناء وغیرہ الفاظ کو بھی حذف کردیگا جسکو بقیہ حدیث سے پورا تعلق ہوگا۔

(باقی آئندہ)

[۲] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ۔